(غلام گردش)

کیا انصاف حاصل کرنے کیلئے خودکشی کی جائے؟

ایم او کالج لاہور کے ایک لیکچرار نے خودکشی کر لی۔ اسکے ہاتھ کا لکھا ہوا خط میرے سامنے میز پر پڑا ہوا ہے۔ محمد افضل محمود انگریزی زبان کا اُستاد تھا۔ جوان انسان۔ تصویر میں تیس پینتیس برس کا نظر آ رہا ہے۔ عام سا آدمی۔ مگر اسکے اندر جو ٹوٹ پھوٹ جاری تھی، کوئی اسکا اندازہ نہیں لگا سکا۔ نہ اسکے اہل خانہ، نہ کالج کی غیر سنجیدہ انتظامیہ اور نہ ہی اسکے طالبعلم۔ اسکے دوسطری خط نے ہمیں اپنے معاشرہ کی اصل تصویر دکھائی ہے۔ وہ بھیانک چہرہ جس سے تمام اہل قلم گھبراتے ہیں۔ نوے فیصد تو خیر سماج کی تلخ حقیقتوں کو من وعن تسلیم ہی نہیں کرتے۔ انکے نزدیک تو اس ملک میں صرف پاکیزہ فرشتے رہتے ہیں۔ ویسے شائد وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ دس نمبر ملک دس نمبر فرشتوں ہی کا مسکن ہوسکتا ہے۔

افضل محمود کون تھا۔ کہاں سے آیا۔ نوکری کیسے ملی۔ مجھے کچھ علم نہیں۔ جاننا بھی نہیں چاہتا۔ اسلیے کہ ہر پڑھے لکھے شخص کی طرح وہ بھی ''بے حیثیت'' تھا۔ اس ملک کی بات کر رہا ہوں۔ ورنہ مغربی دنیا میں اُستاد سے اوپر کوئی پیشہ نہیں ہے۔ اسکا قصور کیا تھا۔ یہ اہم ترین نکتہ ہے۔ اس پر بات شروع ہوتی ہے اور یہیں ختم ہوتی ہے۔ ایم اے او کالج میں ماس کمیونیکیشن ہی کی ایک طالب کو اس بدقسمت لیکچرار نے ڈانٹا اور بطور اُستاد کہا کہ وہ اسکی خواہش پر اسکے نمبر نہیں بڑھا سکتا۔ خاتون طالبعلم نے نمبر بڑھانے کیلئے ''حکم'' دیا ہوگا۔ افضل محمود نے انکار کر دیا۔ اس سال جولائی میں اس لڑکی نے کالج کے پرنسپل یا انتظامیہ کو لکھ کر شکایت کی کہ افضل طالبات سے بدتمیزی کرتا ہے۔ بلکہ اس شکایت میں ''جنسی بنیاد پر خوف زدہ'' Sexeul Harrassment کا الزام بھی شامل تھا۔ یہ الزام، دراصل کوئی شکایت نہیں بلکہ کسی بھی لڑکی کے پاس تیز ترین ہتھیار ہے۔ اسکا ہمارے جیسے ملکوں میں ویسے کوئی توڑ بھی نہیں ہے۔ مغرب میں بہرحال صورتحال ہمارے معاشرے سے بالکل متضاد ہے۔ وہاں اگر کوئی مرد شکایت کرتا ہے کہ اسے کوئی بھی خاتون تنگ کر رہی ہے، اجنبی طور پر ہراساں کر رہی ہے۔ تو اس شکایت کا جائزہ لینے کا طریقہ کار بالکل وہی ہے جو متضاد طرح کی شکایت کا ہوسکتا ہے۔ بعض قانون کے مطابق عورت اور مرد کو برابر کا فریق تسلیم کیا گیا ہے اور ایک فریق کو جنس کی بنیاد پر دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔ لیکن ہمارے جیسے ملک میں اگر کوئی لڑکی یا خاتون، اس طرح کی شکایت کرے تو اسے لازماً درست سمجھا جاتا ہے۔ عام تصور یہی ہے کہ کوئی بھی لڑکی، اس معاملے میں غلط بیانی سے کام نہیں لیگی۔ مگر اس خام خیالی کو درست ہونا چاہیے۔ جتنا خوف ڈونگی مردہ پھیلا سکتا ہے۔ اتنی ہی جنسی فعل سازی عورت بھی کر سکتی ہے۔ ہماری سوچ اور قانون کو صرف سچ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ نا کہ عام معاشرتی خیال کے ساتھ۔ مگر بہرحال یہاں کی سماجی درستگی میں شائد وقت لگے۔

بہرحال افضل محمود کے خلاف شکایت کی تحقیقات کیلئے کالج کے پرنسپل نے کوئی کمیٹی تشکیل جس میں ڈاکٹر عالیہ نام کی پروفیسر شامل تھی۔ ڈاکٹر عالیہ رحمان نے اس معاملے کی جانچ پڑتال کی۔ اسکے مطابق، پروفیسر افضل کے خلاف الزامات مکمل طور پر لغو اور بے معنی تھے۔ ان میں کسی قسم کا سچ نہیں تھا۔ بلکہ طالبہ نے صرف نمبر نہ بڑھانے پر غلط الزامات لگائے تھے۔ یہ انکوائری رپورٹ 13 جولائی کو مکمل

کر کے پرنسپل آفس بھجوادی گئی۔یعنی 8 جولائی کو اس طالبہ نے پروفیسر کے خلاف درخواست دی۔تقریباً پانچ دن میں تحقیقات مکمل کر لی گئیں۔ڈاکٹر عالیہ رحمٰن نے رپورٹ میں توازن سے لکھا کہ افضل محمود مکمل طور پر بے گناہ ہے۔جولائی سے اکتوبر تک یہ رپورٹ پرنسپل کے پاس پڑی رہی۔کس لیے اور کیوں۔محکمہ تعلیم کے انچارج اور وزیر اعلیٰ کو بہر حال پرنسپل سے پوچھنا چاہیے۔مجھے اصل حقائق کا قطعاً علم نہیں مگر بادی النظر میں پرنسپل آفس میں انکوائری رپورٹ کا اتنے عرصے کیلئے پڑے رہنا، بے جواز نظر آتا ہے۔

اس اثناء میں افضل محمود بار بار لکھتا رہا کہ اسے تحقیقات کی روشنی میں بے گناہ ہونے کا خط جاری کیا جائے تا کہ اسکے پاس کوئی دستاویزاتی ثبوت موجود رہے۔مگر نامعلوم وجوہات کی بنیاد پر پرنسپل یا انکوائری کمیٹی نے ایسا کوئی خط جاری نہیں کیا۔پروفیسر اتنے کرب اور دکھ میں مبتلا ہو گیا کہ اسے ایسا لگا کہ اب اسے کسی اور انکوائری میں شامل کیا جائیگا اور گناہ گار بنا دیا جائیگا۔اسی ذہنی کشمکش میں اسکے گھریلو حالات بھی بگڑ گئے۔اہلیہ نے اسے بدکردار گردانا اور چھوڑ کر چلی گئی۔پروفیسر کیلئے یہ تمام معاملات عذاب کی صورت اختیار کر گئے۔صرف ایک خط کی تلاش تھی جو کہ اسے بے گناہ ثابت کر سکے۔اکتوبر کی آٹھ تاریخ کو اس نے ڈاکٹر عالیہ کو انگریزی میں خط لکھا جس میں ساری روداد لکھی۔اپنی ذہنی کیفیت بھی بیان کی۔18444 جو کہ اس طالبہ کا رول نمبر تھا۔درج کرنے کے بعد یہ بھی لکھا کہ اس لڑکی کو کالج سے نکالا جائے تا کہ یہ دیگر اساتذہ کے خلاف ایسی حرکت دوبارہ نہ کر پائے۔اس نے یہاں تک درج کیا کہ اگر وہ مر جائے تو تنخواہ اسکی والدہ کے حوالے کی جائے۔مزید، اسکی والدہ کو ایک سرٹیفیکٹ بھی دیا جائے کہ اسکا بیٹا اچھے کردار کا مالک تھا۔یہ خط کالج کے پرنسپل کی جانب سے دیا جانا چاہیے۔اس خط میں ایک ایک لفظ بتا رہا تھا کہ پروفیسر کو شدید ذہنی دباؤ کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور اسے صرف اور صرف انصاف کی ضرورت ہے۔حد درجہ بدقسمتی یہ ہے کہ وہ خط جو اسکو دستاویزاتی طور پر بے گناہ قرار دے پائے، کالج انتظامیہ کی طرف سے کبھی بھی جاری نہیں ہو سکا۔اس خط کے ٹھیک ایک دن بعد یعنی 9 تاریخ کو افضل نے تین سطری نوٹ لکھا۔یہ نوٹ یا خط نہیں بلکہ ایک نوحہ ہے۔ایک بے گناہ کی فریاد ہے۔اس نے درج کیا کہ وہ یہ تمام معاملہ خدا کی عدالت پر چھوڑتا ہے۔پولیس کے متعلق بھی لکھا کہ اس معاملے کی کوئی انکوائری نہ کرے اور کسی کو بھی تنگ نہ کرے۔اگر دیکھا جائے تو پروفیسر نے اس طالبہ کو بھی معاف کر دیا۔اس نوٹ کے بعد، افضل نے زہر کھایا اور جہان فانی سے کوچ کر گیا۔اس قدر اذیت میں تھا کہ اس نے موت کو ترجیح دی اور خاموشی سے دنیا سے چلا گیا۔

اس نوجوان پروفیسر نے خودکشی تو کر لی مگر وہ ہمارے معاشرے کی ایک ہولناک صورت ہمیں دکھا گیا۔بدبودار اور بگڑا ہوا سماج جسکو ہم کبھی بھی تسلیم نہیں کرتے۔کیونکہ اپنی ہولناک تصویر دیکھنے کیلئے بہت ظرف چاہیے۔جو بہر حال اوپر سطح سے لیکر نیچے تک خطرناک حد تک کم ہے۔پہلا سوال تو یہ ہے کہ جنسی ہراسگی کو صرف اور صرف مرد سے منسوب کیا جاتا ہے۔اس فکر میں بہر حال تبدیلی کی ضرورت ہے کہ خاتون بھی مرد پر بہتان لگا سکتی ہے۔اسکے متعلق جھوٹے الزامات لگا سکتی ہے۔اسکی زندگی برباد کر سکتی ہے۔اس موقعہ پر گلوکار علی ظفر کا ذکر کرنا بالکل بے محل نہیں۔اسلیے کہ ایک خاتون گلوکارہ، میشا شیخ نے اس پر جنسی ہراسگی کا الزام لگایا، جسکے لیے علی ظفر کو عدالت میں جانا پڑا۔عدالت میں ثابت ہوا کہ میشا شیخ کے الزامات بے بنیاد تھے۔دوسرا سوال یہ بھی ذہن میں آتا ہے کہ کالج کی انتظامیہ اس درجہ غافل کیسے رہی کہ صرف ایک خط جاری کرنے سے تین ماہ تک گریزاں رہی۔آخر وہ کون سے عوامل تھے، جس نے کالج کے سربراہ یا تحقیقاتی ٹیم

کو بے گناہ ہونے کے ایک خط کو جاری نہ کرنے دیا۔ کیا اس خط کو جاری کرنے کیلئے وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ یا وزیر تعلیم سے اجازت کی ضرورت تھی۔ ہرگز نہیں۔ یہ مقامی سطح کا انتظامی معاملہ تھا جسے میرٹ پر حل نہیں کیا گیا۔ میرا مشورہ ہے کہ اس معاملے کی جانچ ہونی چاہیے کہ ایک انسان کی عزت اور نوموس کو اس درجہ غیر سنجیدگی سے کیوں لیا گیا۔ تیسری بات، کہ اس طالبہ نے جھوٹا الزام لگایا۔ ایک شریف آدمی اپنی جان سے گیا۔ ایک خاندان برباد ہو گیا۔ مگر اس لڑکی کو کوئی سزا نہیں دی گئی۔ اسے کالج سے نہیں نکالا گیا جو جہ حد درجہ کم سزا ہے۔ ورنہ مغربی ممالک میں تو ایک بہت سنجیدہ جرم ہے، جسکی سزا دس سے پندرہ برس تک ہے۔ بہر حال کیونکہ یہ ایک انتہائی ''پاک صاف'' معاشرہ ہے، لہذا اس میں کیسا انصاف اور کیسی دہائی!

خواتین کی برابری اور انکے یکساں حقوق کیلئے ہمیشہ لکھتا آیا ہوں۔ آج بھی اس فلسفہ پر قائم ہوں کہ عورت کے قانونی، سماجی اور خاندانی حقوق ہر طور پر مرد کے برابر ہیں۔ انکو زندگی میں آگے بڑھنے کے مواقع ہر صورت میں ملنے چاہییں۔ اگر کوئی شخص، خواتین کے حقوق کی بے حرمتی کرے، تو اسے قرار واقعی سزا ملنی چاہیے۔ مگر اسکے بالکل ساتھ یہ بھی عرض کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ عورت بھی مرد پر جھوٹے الزامات لگا سکتی ہے۔ وہ بھی غلطی کر سکتی ہے۔ اگر بے لاگ تحقیقات کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ مرد پر لگائے گئے الزامات بالکل ناجائز اور خود ساختہ ہیں، تو خاتون کو ضعف نازک ہونے کا فائدہ نہیں دینا چاہیے۔ اسکے خلاف بھی قانون کے مطابق کاروائی ہونی چاہیے۔ مگر یہاں کاروائی تو دور کی بات، ایم اے او کالج کی انتظامیہ نے بے گناہ پروفیسر کو ایک خط تک جاری نہیں کیا۔ افضل زہر کھا کر مر گیا مگر مرتے دم تک اسے انصاف نہ مل سکا۔ مرنے کے بعد تو اسکی فائل ویسے ہی بند ہو جائیگی۔ اسلیے کہ مرنے کے بعد تو جزا اور سزا تو صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ انسان، دنیاوی عدالتوں اور ہمارے ملک کے دو نمبر انصاف سے بہت اوپر نکل جاتا ہے۔ اب کیا بات کریں۔ افضل کو اب انصاف کی ضرورت نہیں رہی۔ مگر اس نے خودکشی کر کے یہ ضرور ثابت کر دیا کہ معاشرہ کس درجہ ادنیٰ ہے۔ شائد اب ہمارے عظیم ملک میں انصاف حاصل کرنے کیلئے خودکشی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا!

راؤ منظر حیات